محمد سید علی
اسکالر ، پی ایچ۔ڈی اُردو، شعبہ اُردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی،لاہور

اکرام اللہ کا افسانوی مجموعہ "جنگل": تنقیدی مطالعہ

Muhammad Said Ali
Scholar Ph.D Urdu, Dept. of Urdu, University Oriental College, PU, Lahore.

Ikramullah's fictional collection "The Jungle": Critical Study

Ikramullah's legendary collection "Jungle" has nine stories in total. The first four stories are based on realism, while the next four stories are symbolic and abstract. An allegorical drama is also part of the book. Human psychology, lust, social injustice, selfishness, poverty, compulsions, hunger, sex desire, virtual love, Man's tampering with nature, human instability are the main themes of these stories. These stories prove that Ikramullah's pen has immense potential for narrative, dialogue, observation, feelings, play of consciousness and subconscious, characterization and imagery. The beauty of all these short stories is that despite the symbolism and abstraction, the story is not lost. This article provides a critical overview of Ikramullah's fictional collection "Jungle".

Keywords: *Short Story, Allegory, Colonialism, Progressivism, Modernism, Symbolism, Abstraction.*

ممتاز ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار اکرام اللہ ۲۹ /فروری۱۹۲۹ء کو جنڈیالہ ضلع جالندھر (موجودہ بھارت) میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے وقت وہ اپنے والد اور ملازم کے ہمراہ امرتسر سے لاہور آئے تھے۔[1] والد پیشہ کے اعتبار سے سرکاری ڈاکٹر تھے، ان کی مختلف شہروں میں تقرری کے سبب اگرچہ اکرام اللہ امرتسر، لاہور، موگا، سلانوالی، بورے والا اور ملتان میں رہے۔ مگر بھرپور یادوں کے سلسلے میں وہ امرتسر، لاہور اور بالخصوص ملتان کو اپنا شہر مانتے ہیں۔ میٹرک لاہور سے اور ایف.اے، بی.اے ملتان سے کرنے کے بعد ایل ایل بی کے واسطے اکرام اللہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں وارد ہوئے۔

اس زمانے کا لاہور اور یونیورسٹی وولنر ہاسٹل ان کے ناول"سائے کی آواز" میں دیکھا جا سکتا ہے۔[۲] ملتان آ کر وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نجی انشورنس کمپنی میں ملازمت بھی کر لی۔ بعد ازاں وہ کمپنی اسٹیٹ لائف پاکستان میں ضم ہو گئی۔ ۱۹۹۰ء میں اکرام اللہ اسسٹنٹ جنرل مینیجر ریٹائر ہوئے۔ اگرچہ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی امریکہ میں مقیم ہیں مگر اکرام اللہ آج کل لاہور میں آباد ہیں۔

ان کی تصانیف میں دو افسانوی مجموعے"جنگل" (۱۹۷۲ء) اور"بدلتے قالب "(۱۹۹۲ء)، چار ناولٹوں پر مشتمل اکادمی ادبیات کی جانب سے وزیرِاعظم ادبی ایوراڈ یافتہ کتاب" سوا نیزے پر سورج " (۱۹۹۷ء)، تین افسانوں اور تین ناولٹوں کا مجموعہ"بارِ دگر "(۲۰۰۵ء) اور دو ناول" سائے کی آواز"(۲۰۰۱ء)،" گُرگِ شب"(۱۹۷۸ء) شامل ہیں۔ آخر الذکر ناول کی شہرت کی تین وجوہ ہیں۔ پہلی اس ناول کا تمثیلی انداز اور بیان کی خوبی، دوسری ضیاء الحق دور میں ضبطی و مکمل پابندی، تیسری وجہ بانو قدسیہ پر"راجہ گدھ "میں اس ناول کے سرقہ کا الزام۔"بدلتے قالب "کے افسانے پہلے پہل احمد ندیم قاسمی کے رسالے" فنون" میں چھپے تھے۔ جب کہ اس افسانوی مجموعے کوPTV سے اسد محمد خاں کی ڈرامائی تشکیل میں دو قسطوں میں پیش کیا گیا۔ عظمیٰ گیلانی ڈرامے کی ہیروئن اور ساحرہ کاظمی پروڈیوسر تھیں۔ حال ہی میں اکرام اللہ کی خود نوشت سوانح" جہانِ گزراں "(۲۰۱۹ء) القا پبلی کیشنز لاہور سے منصہ شہود پر آئی ہے۔

ہمارا موضوعِ مطالعہ اکرام اللہ کااولین اور منفرد افسانوی مجموعہ" جنگل "ہے۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۷۲ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں کہانی کا روایتی انداز لیے حقیقت پسندی پر مشتمل چار افسانے، چار علامتی کہانیاں اور ایک تمثیلی ڈرامہ شامل ہے۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر سلیم اختر نے، اندرونی فلیپ محمد کاظم اور بیرونی فلیپ محمد خالد اختر نے لکھا ہے۔

افسانہ"اُتم چند "ہمارے معاشرے اور اس کی تربیت و سلوک پر گہرا طنز ہے۔ اُتم چند گاؤں کے ایک نہایت سیدھے سادے اور عام آدمی لالہ دونی چند کا اکلوتا لڑکا ہے۔ لعاب بھرے ہونٹوں پر جمے بڑے دانتوں اور لاغر جسم کے سبب سکول میں کسی نے کبھی اُتم چند کو اپنا دوست نہ رکھا تھا۔ اس پر مستزاد اکلوتے لڑکے کو سنبھالے رکھنے کی غرض سے کی گئی لالہ جی کی بے جا سختی اور مارپیٹ، جس نے اُتم چند کو بزدلی اور احساسِ کمتری کے گڑھے میں ہمیشہ کے لیے پھینک دیا۔ سکول کے شرارتی لڑکے کیا کیا کانڈ نہ کرتے تھے۔ ماسٹر، چپڑاسی، گاؤں کے بڑے بوڑھے، چھوٹی بڑی لڑکیاں اور خود اُتم،کوئی بھی تو

اُن کے شر سے محفوظ نہ تھا۔ اُن کے مقابلے میں اُتم گھر، دوکان اور سکول کا کام مستعدی سے کرنے والا سیدھا سادہ محنتی لڑکا تھا۔ مگر پھر بھی کوئی اس کا نہ تھا۔ قصبے سے میٹرک پاس کر چکنے کے بعد لالہ دونی چند اُتم کو لے کر اپنے دیرینہ دوست، مگر رتبے میں بڑے، رائے صاحب موہن لال کے پاس جا پہنچے۔ رائے صاحب نے اُتم چند کی تقرری ڈی سی آفس میں بحیثیت کلرک کرا دی اور اپنے محلے میں ایک کرایے کا کمرہ بھی دِلا دیا۔ مگر شہر میں اُتم چند کے ساتھ گاؤں سے بدتر سلوک ہوا۔ جس نے اُس کی یاسیت، بزدلی، خالق و مخلوق، پیدا کرنے والی ماں اور خود پر غصے میں اضافہ کر دیا:

"کوئی ہنستا تو وہ جھٹ پلٹ کے دیکھتا کہ کہیں اس کے لباس کا تمسخر تو نہیں اُڑایا جا رہا۔ دفتر میں تمام وقت اُسے اپنے منحنی جسم، اُبھرے ہوئے دانتوں اور لعاب سے تر غلیظ ہونٹوں کاا حساس رہتا۔ وہ دل میں جھنجھلا اُٹھتا کہ یہ دفتر والے جوگندر اور بخشیش کی طرح کہہ کیوں نہیں دیتے کہ تو بدصورت چمگادڑ ہے۔ یہ اپنے دل ہی دل میں کیوں مجھ پر ہنستے رہتے ہیں۔۔۔ اس بھاگتی دوڑتی زرق برق زندگی میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ احساس اس کی پھیکی زندگی میں تلخی گھولتا چلا جا رہا تھا۔ "(۳)

اُتم چند کو پہلی نظر میں ہی رائے صاحب کی بڑی بیٹی شیلا سے محبت ہو چلی تھی۔ اُتم چاہتا تھا کہ شیلا کو اپنی محرومیوں اور زمانے کی زیادتیاں بتلائے۔ وہ اس سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے خوبصورت جسم کا لمس اور خوشبودار بالوں کو سہلانا چاہتا تھا۔ اُس شوخ لڑکے کو روکنا چاہتا تھا جو شیلا سے ملنے اس کے گھر تک آ جاتا تھا۔ مگر شیلا اُتم سے بات کرنا تو دور اُسے دیکھنا تک گوارا نہ کرتی تھی۔ پھر ایک دن رائے صاحب کی چھوٹی لڑکی" منی "گلی میں کھیلتے کھیلتے اُتم چند کے کمرے میں آن دھمکی۔ منی میں شیلا کی جھلک نے اُتم کی خواہشات کے سمندر میں تلاطم پیدا کر دیا۔ اور پھر:

"منی کے سوالات کے جواب میں اُتم کے فقرے چھوٹے ہوتے ہوتے بے معنی سی ہوں ہاں تک محدود رہ گئے۔اُس کے ذہن میں صرف ایک لا متناہی گونج تھی۔ جو بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سننے دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں اُس ایک گونج کی لپیٹ میں آ کے بیکار ہو گئیں۔

اُس نے حیرت و خوف سے دم بخود منی کو بستر پر لٹا دیا اور لالہ جی کی جھڑکیوں سے لے کر شیلا کی بے رُخی تک کی تمام زیادتیوں کا بدلہ اُس سے چکانے لگا۔ "(۴)

تیسرے روز کمرے کا دروازہ توڑا گیا تو منی کی خون میں لتھڑی لاش کے عین اوپر اُتم چند پھانسی کے پھندے سے لٹکا پایا گیا۔ ماں سے ورثے میں ملی بد صورتی، باپ کی بے جا سختیاں اور مار پیٹ، ہم جماعت لڑکوں کی بے لگام شرارتیں، معاشرے کی بے رُخی اور شیلا کی نفرت، ایسی ڈھیروں محرومیوں نے ایک سیدھے سادھے انسان کو بزدلی کا ایسا وِش پلایا کہ خواہشات کے سانپ نے اپنا سارا زہر ایک ننھی منی بچی میں اُتار دیا۔

ہمارے معاشرے میں آئے روز چھوٹی بچیوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات سامنے آتے ہیں۔ ان سفاک مجرموں میں سے کچھ تو تختہ عبرت تک بھی پہنچ چکے۔ مگر اکرام اللہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ کیا معاشرہ اس عمل سے اپنی تمام تر ذمہ داریوں سے سُبک دوش ہو جاتا ہے۔ آخر انسان درندہ کیوں بنتا ہے؟ اس کی سفاکیت اور درندگی کی ایک بڑی وجہ اس کے ارد گرد کا ماحول اور خود معاشرہ ہی ہوتا ہے۔ حیوان کا گلہ گھونٹنے سے کہیں ضروری معاشرے کی خود کی تربیت ہے۔ والدین کی توجہ، معاشرے کا اچھا سلوک اور یاسیت و محرومیوں میں کمی انسان کو وحشی درندہ بننے سے روک سکتی ہے۔

افسانہ "محتاج" دہلی کی جامع مسجد کے باہر بھیک مانگنے والے دو نابینا فقیروں بخشو اور فتو کی کہانی ہے۔ جنہوں نے شہر کے گندے نالے پر ٹین کی عارضی جھونپڑی ڈالی ہوئی ہے۔ جہاں بدبو تو بہت ہے مگر میونسپلٹی اور مکان مالک کے کرایہ کا چنداں خوف نہیں۔ دونوں تیس سال سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ مگر ایک دن ان میں نوراں آن شامل ہوئی۔ اگرچہ نوراں تین خاوند اور ڈھیروں گاہک کر چکی ہے مگر اب جوانی اسے دھوکہ دینے پر آمادہ ہے۔ طوائف کے لیے صحت و جوانی، جب کہ فقیر کے لیے ضعیفی و بیماری نعمت ہوتے ہیں۔ اور بیچاری نوراں کے پاس یہ دونوں نہ تھے۔ وہ تندرست تھی پر جوان نہ رہی تھی۔ ڈھلتی عمر میں تو عشوہ و ادا بھی نہیں جچتے۔ تو اب نہ گاہک اسے منہ لگاتے تھے اور نہ ہی کوئی اپاہج فقیر جان کے اُس کی جھولی میں کچھ ڈالتا تھا۔ چار و ناچار اسے دو اندھے فقیروں کا سہارا لینا پڑا۔ اس افسانے میں اکرام اللہ کا عمیق مشاہدہ جھلکتا ہے۔ فقیروں کی چھوٹی چھوٹی حرکات، سوچ اور نفسیات کو گہرائی سے پیش کیا گیا ہے۔ خیرات ملنے سے متعلق بخشو اور فتو کی دلچسپ گفتگو دیکھیے:

"پیالے سے چھن کی آواز اُبھرتی تو بخشو ہاتھ بڑھا کر سکہ نکال لیتا اور نوراں کی ران پر سے ہاتھ پھیلاتا ہوا اس کی مٹھی میں دبا دیتا اور ہلکی سی چٹکی لے لیتا۔ فتو صدا بند کر کے بے قراری سے بخشو کی جانب جھک کے پوچھتا، کیا تھا، وہ نہ بتاتا تو پیچھے سے نوراں کا پلو کھینچتا۔

'کیوں ری !بتا تو سہی کیا تھا۔' 'دس پیسے تھے اور تیرا سر تھا۔ 'وہ کچھ یقین کرتے ہوئے کچھ نہ کرتے ہوئے کہتا' : اچھا دس ہی پیسے تھے۔ آواز تو چونی کی طرح سُبک تھی۔ 'بخشو فیصلہ کُن انداز میں کہتا' چونی والے زمانے گئے۔ آج کل کوئی دس ہی پیسے دے دے تو بہت ہیں۔ "(۵)

نوراں نے بخشو کو پورا اپنے بس میں کر لیا تھا، اب وہ ان دونوں کو گرم کھانا خود پکا کے کھلاتی، رات کو بخشو کا بستر گرم کرتی اور کمائی کا ایک بڑا حصہ بخشو کی رضا مندی سے اُڑا لیتی۔ پھر ایک دن جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک ایسا لڑکا آیا کہ ساری خیرات اسی کو ملنے لگی۔ نوراں نے پہلے تو بخشو اور فتو کو جیسے تیسے منا کے لڑکے کو اپنے ساتھ مِلا لیا۔ پھر ایک دن موقع پا کر وہ بے چارے نابینا فقیروں کی کل جمع پونجی لے اُڑا، نوراں اس نوجوان سُریلے فقیر کے سنگ بھاگ گئی۔ یہ افسانہ زندگی گزارنے کے لیے انسان کے نت نئے جتن اور خود غرضی کی کہانی ہے۔

مختصر افسانہ" ایک دوپہر "احمد اور زینو کی عشقیہ داستان ہے۔ ساری عشقیہ داستانوں کی طرح اس کا انجام بھی المیہ پر ہے۔ مگر یہ المیہ دوسری داستانوں سے یکسر مختلف ہے۔ زینو اور احمد اپنے تین ہٹے کٹے دوستوں کی مدد سے رات کے اندھیرے میں بھاگ کرا سٹیشن پہنچتے ہیں۔ نازک بدن اور نہایت خوبصورت چہرے والی زینوا پنے محب احمد کے لاڈ اُٹھاتی ہے اور شکریہ ادا کرتی ہے کہ اگر وہ اسے بر وقت نہ بھگاتا تو وہ کسی اور کی ڈولی میں بیٹھنے سے پہلے زہر کھا لیتی۔ اُسے احمد کی جدائی کسی بھی قیمت پہ قبول نہ تھی۔ وہ اس کے ساتھ دور کہیں سپنوں کے دیس میں رہنا چاہتی ہے۔

مگر کڑکتی دوپہر میں ٹرین سے پہلے ہی زینو کا باپ اور بھائی سٹیشن پہنچ جاتے ہیں اور کلہاڑیوں کے وار سے احمد کو ساتھیوں سمیت ڈھیر کر دیتے ہیں۔ لیکن جب کلہاڑیاں زینو کی جانب لپکتی ہیں تو وہ باپ کے قدموں میں گر جاتی ہے:

"بابا !یہ مجھے زبردستی اُٹھا لائے تھے۔ میرا کوئی قصور نہیں بابا۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ 'گاڑی لحظہ بھر کے لیے رُکی جیسے کوئی بہت بڑا اژدھا صحرا میں چلتے چلتے غذا کا ایک آدھ لقمہ سمیٹنے کے لیے رُکا ہو اور پھر چل پڑا ہو۔"(۶)

اور پھر احمد کے بِنا مر جانے کی باتیں کرنے والی زینو موت کے خوف سے اپنے باپ کی پیٹھ پہ سر رکھے ٹکائے گھر چلی جاتی ہے۔ یہ کہانی محبت اور زندگی کی سچائیوں کو آشکار کرتی ہے۔ احمد کے دوستوں کی زینو کے بارے لالچ اور بہادری و بزدلی میں سے کسی ایک شے کا چناؤ۔ اور پھر زینو کا کردار، زندگی کی تہہ داری اور مختلف اوقات میں انسان کے غیر متوقع رویوں کے بارے میں کئی سوالوں کو جنم دیتا ہے۔

کہانی" احتیاج "(حاجت، خواہش) کی ابتدا گالیوں سے ہوتی ہے۔ شرماں اور گانمن گاؤں کے زمیں داروں اور وڈیروں کی بھینسیں چرانے دریا کنارے آئے ہوئے ہیں۔ مگر دونوں جوان لڑکا لڑکی کی ایک دوسرے سے ٹھنی رہتی ہے۔ کچھ دن پہلے شرماں کی ماں، گانمن کی ماں کے پاس سفارش لائی تھی کہ تیرا بیٹا تو گاؤں والوں کی بھینسیں چرانے جاتا ہی ہے، اسے کہو شرماں کو بھی ساتھ لے جایا کرے۔ ہمارے پاس تین ہی تو بھینسیں ہیں۔ اسی بہانے ہمیں پٹواری اور نمبردار سے دو وقت کا کھانا مل جائے گا۔ اُس وقت تو گانمن مان گیا مگر ان کی آپس میں بالکل نہ بنی۔ اور معاملہ گالم گلوچ اور ایک دوسرے کی بھینسوں کو دریا میں دھکیلنے تک جا پہنچا۔ مگر جب شرماں غصے سے بھینسوں کے پیچھے لٹھ لیے دوڑ رہی ہوتی ہے تو گانمن پر اُس کی چُست جوانی اور حُسن آشکار ہو جاتا ہے۔ وہ اچانک اس سے محبت سے پیش آنے لگتا ہے اور ساری بھینسیں خود دریا سے نکال لاتا ہے۔ اسی دوران شرماں بھی گانمن کو بغیر کپڑوں کے دیکھ لیتی ہے۔ دونوں تھکن اور بھوک سے نڈھال ہو رہے ہیں۔ مگر وہ جونہی کھانا کھانے بیٹھے تو :

"گانمن نے اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اوپر اٹھایا اور اُس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ اُن کے بدن ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے۔ کھانا پاس کھلا پڑا تھا اور اُس پر دو چمکدار نیلے رنگ کی موٹی موٹی جنگلی مکھیاں زور زور سے بھِنبھنا رہی تھیں۔"(۷)

جس بھوک کو مٹانے اور دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی کے لیے شرماں کی ماں اپنی جوان بیٹی کو گانمن کے ساتھ بھینسیں چرانے بھیج دیتی ہے۔ اسی بھوک اور ضرورت کے تحت شرماں مہینوں میں

ایک بار ملنے والے مکھن، تھوڑے سے دودھ، سوکھی روٹی اور بھینسوں کے گوبر سے بھر جانے والی روز کی ایک ٹوکری کے لیے محنت کرتی رہتی ہے۔ مگر اب کے دونوں کے ذہن پہ خواہشِ نفسانی ایسی غالب آتی ہے کہ مکھن سے چوپڑی روٹیوں پر بھی مکھیاں بھِنبھنا رہی ہوتی ہیں۔

افسانے میں اکرام اللہ نے اگرچہ انسان کی دو اہم حاجتوں (ضرورتوں) بھوک اور سیکس (sex)کو بیان کیا ہے اور سیکس کو بھوک سے اوپر دکھایا ہے مگر یہ فارمولا ہر جگہ اور ہر بار اپلائی نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سی جگہوں پہ بھوک، سیکس پر اور کچھ جگہوں پر سیکس بھوک پر غلبہ ضرور پاتا ہے، مگر انسانی رویہ، مختلف اوقات میں مختلف ہوتا ہے۔ منٹو نے اپنی ایک کہانی" سو کینڈل پاور کا بلب "میں بھوک اور سیکس سے کہیں زیادہ ضروری"نیند "کو بتایا ہے۔۸ مگر یہ سبsituation پر ہے۔ انسان مختلف اوقات میں مختلف حاجتیں رکھتا ہے۔ اس کا رویہ انہی حاجتوں اور انہی ضرورتوں کے سبب چاہے ان چاہے تبدیل ہوتا ہے۔ بھوک، پیاس، سانس، نیند اور سیکس، انسان کی بنیادی ضروریات ضرور ہیں۔ لیکن اکثر اوقات اوّل الذکر چار چیزیں، آخرالذکر کی نسبت زیادہ ضروری اور زیادہ اہم ہو جاتی ہیں۔ اور بعض لوگوں کے لیے ایک وقت میں تو سیکس بہت کم یا بالکل اہمیت نہیں رکھتا۔ بچے، بوڑھے، بے شعور اور چوتھی قسم کے لوگوں کی زندگی میں سیکس کے لیے جگہ نہیں ہوتی۔ مگر پہلی چار چیزیں ان کے لیے اور ہر ایک کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اکثر سیکس ورکر بھی سیکس کو اپنی پہلی چار بنیادی ضرورتوں کی بہتر فراہمی کے لیے اپناتی ہیں۔ ورنہ ہر چاہے ان چاہے کے ساتھ تعلق قائم کرنا اور لگاتار کرتے جانا کوئی نہیں چاہتا۔ نہ مرد اور نہ ہی عورت۔

"پُل اور نقلی چوکیدار "ایک علامتی کہانی ہے۔ ایک بڑا سا پل، جس کے دونوں سرے ناپید اور ستون آسمانوں میں اوجھل ہو جاتے ہیں۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے پل اَٹا پڑا ہے۔ ان میں سے کچھ نے ستونوں سے بھی لمبے بانس اٹھائے ہوتے ہیں جن پر کئی سروں والے خوفناک نقلی چوکیدار ناچ رہے ہیں۔ سبھی ان سے ڈرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا خوف و دبدبہ ان کے اوپر لیٹے آسمانوں کو تکنے والوں پر نہیں چلتا، پر وہ انہیں بھی جیسے تیسے خاموش کرا دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی پیٹھ پر بے جا بوجھ لادے اور اپنے ساتھی سے جڑے چل رہے ہیں۔ پھر ایک ایک کر کے وہ پل کے جنگلے سے لگ کے کھڑے ہو جاتے ہیں اور نیچے اتھاہ گہرائیوں میں کبھی نہ لوٹنے کے لیے کود جاتے ہیں۔ اکرام اللہ نے علامت کے ذریعے پل کو ہماری دنیا سے تشبیہ دی ہے۔ جہاں ہم ایک دوسرے سے کچھ مجبوریوں میں بندھے چلے جا رہے ہیں۔ کہیں معاشرے اور لوگوں کا خوف ہے تو کہیں اس دنیا پر حکومت کرنے والے نقلی چوکیداروں کا۔ نقلی

چوکیدار اپنا دبدبہ اور خوف برقرار رکھنے کے لیے نت نئے تماشے کرتے رہتے ہیں۔ انسان ان کے آگے جھکے جھکے موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ نقلی چوکیداروں کے دبدبے اور خوف میں زیادتی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک یتیم بچی خوف سے کپکپاتی ہوئی کہتی ہے:

"میرا باپ کہہ گیا تھا نقلی چوکیداروں کا احترام کرنا۔ میں دو دن سے ٹماٹر جیسے گالوں والے سے کھانا مانگ رہی ہوں۔ وہ اپنے سفید سفید دانت نکوسے، آنکھیں موندے ہنستا رہا ہے۔ یہ نقلی چوکیدار کیا کر سکتے ہیں؟"ہش ...ش ... ش۔آہستہ بولو، کوئی سُن لے گا تو آفت آ جائے گی۔ یہ نقلی چوکیدار ہم جیسوں کے لیے مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں لیکن کھانا نہیں دے سکتے۔ "(۹)

یہ استعمار، یہ ڈر کا کاروبار چلانے والے حکمران، یہ بانسوں پر ناچتے کریہہ الشکل نقلی چوکیدار بے ڈھنگی پابندیوں سے انسان اور انسانیت کو کُچلتے رہتے ہیں اور اپنا دبدبہ قائم رکھتے ہیں۔ وہ صرف اپنی من مانی کرتے ہیں۔ سماج کو روایات و اقدار اور شرح و قانون کی پابندیوں کے نام پر اس طرح جکڑ دیتے ہیں کہ ان کا جوڑا ہوا اگر کہیں من مانی کرے تو، یا تو اسے اپنے بازوؤں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے یا پُل کے جنگلے سے کود کر موت کو گلے لگانا پڑتا ہے۔ مگر ان کا فقط یہی انجام نہیں۔ ان کی بچیوں کو یتیمی میں ان سے کہیں زیادہ بھگتنا پڑتا ہے۔ مائیں بھوک اور افلاس کے ہاتھوں اپنی بچیوں کو نقلی چوکیداروں کی جیبیں سونے سے بھر دینے والے بھوکے بھیڑیوں کے آگے ڈالنے پر مجبور ہو جاتی ہیں :

"بچی کی قوسیں اُبھر آتی ہیں، کولہے گول اور گُداز ہو جاتے ہیں۔ موٹی عورت ایک تھیلے میں سے ڈگڈگی نکال کے اس کے سر پر بجانا شروع کر دیتی ہے۔ اور ہانک لگاتی ہے' دیکھو دیکھو تازہ ککڑی کی مانند نرم و نازک '۔۔۔ جوان عورت اسے بتاتی ہے' یہ ڈگڈگی تو اب یوں ہی ہر روز بجتی رہے گی۔ گھبراؤ نہیں کچھ ایسی مشکل نہیں۔ ہر عورت کے لیے یہ ایک بہت سیدھا سادا سا کام ہے جیسے سانس لینا، باتیں کرنا۔ "(۱۰)

اور بڑے ستونوں والے بے کنار پل پر یونہی خود غرضی، لا تعلقی اور نفسا نفسی کا ہجوم چلتا رہتا ہے۔ کچھ لوگ پل سے کودتے ہیں، کچھ اپنا بازو کھوتے ہیں۔ بیوائیں تازہ ککڑیاں بیچتی رہتی ہیں۔ آسمانوں

کو تکتے سنہرے سر سوچتے رہتے ہیں۔ نقلی چوکیدار بانسوں پر بُھدکتے رہتے ہیں۔ ڈر کا کاروبار جاری و ساری رہتا ہے۔یوں بھی پل کی علامت اپنے اندر کئی تحیر اور اسرار رکھتی ہے۔ کسی عام پل سے گزرتے وقت بھی انسان کا ذہن تیزی سے چلنے لگتا ہے۔ اور دماغ کئی ایک مناظر اور کئی سوال ایک ساتھ جوڑ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرصہ محشر میں بھی انسان کو جنت تک پہنچنے کے لیے ایک پُل پر سے گزارنے کی بات کی گئی ہے۔ جہاں کی نفسا نفسی، خود غرضی اور لاتعلقی سے سبھی واقف ہیں۔ پل کا ایک مطلب کسوٹی بھی ہے۔ جانچنے کی، سچ آشکارہ کرنے کی کسوٹی۔

علامتی افسانے پر ناقدین و قارئین کا بڑا سوال کہانی تھا۔ پھر تجریدی افسانے میں تو کہانی بالکل ہی غائب ہو گئی۔ ناقدین نے کہانی کے مفقود ہونے کے ساتھ ساتھ افسانے میں معنی کی غیبت کا نکتہ اُٹھایا تو افسانے میں واشگاف معنی سے مبہم اظہار تک کی حمایت کرنے والے میدان میں آ گئے۔ آوازیں اٹھیں کہ مبہم ہونے میں ہرج ہی کیا ہے۔ یہ افسانے کی وسعتوں کو بڑھانے کا کارگر ہتھیار ہے۔ ہاں، افسانہ مہمل نہ ہو۔ بس نقاد اور قاری اس میں سے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق معنی اخذ کر لیں تو کافی ہے۔ مگر نیّر مسعود علامتی افسانے میں کہانی کو لازمی جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی بھی افسانہ بغیر کہانی کے نہیں ہو سکتا:

> "سفر کے موضوع پر ایسا افسانہ زیادہ پسندیدہ ہو گا جو بجائے خود بھی مکمل افسانہ ہو اور سفر کو زندگی کی علامت قرار دینے سے اس میں مزید معنویت پیدا ہو جائے۔ لیکن اگر علامتیں اس طرح برتی جانے لگیں کہ انہیں سمجھے اور علامت مانے بغیر افسانہ بن ہی نہ سکے تو علامتی افسانہ کسی ناکام تجریدی افسانے کی طرح اذیت دے گا۔ "(۱۱)

اکرام اللہ کا افسانہ" جنگل"اپنے اندر علامتوں کے ایک جہان کے ساتھ بھرپور کہانی بھی سموئے ہوئے ہے۔ ایک مسافر جو تین سال پہلے روزی کی تلاش میں گاؤں سے شہر گیا تھا۔ شام سے ذرا پہلے کاندھے پر ایک گٹھڑی لیے بس سے اُترتا ہے۔ گٹھڑی میں اس کے ماں باپ، بہن بھائیوں اور ہونے والی بیوی کے لیے تحائف اور اب تک کی کل جمع پونجی ہے۔ ایک گھنے جنگل کے پار اس کا گاؤں ہے۔ ایک دیہاتی نے اسے جنگل کے خطروں سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور رات وہیں گزارنے کا مشورہ دیا۔ مگر جواب میں وہ ہنس دیا۔ وہ بچپن سے اسی جنگل میں پلا تھا۔ ڈالی ڈالی پات پات اُس کے سنگ بڑے ہوئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس کی لمبی سیدھی پگڈنڈی پر چل سکتا تھا۔ مگر داخل ہوتے ہی

وہ حیرت کے ایک جہان میں پہنچ گیا۔ تین برس میں جنگل یکسر بدل چکا تھا۔ بزرگ درخت کاٹ لیے گئے تھے اور ان کی جگہ نئے درخت اُگ رہے تھے۔سیدھی پگڈنڈی کی جگہ کئی اُلجھے راستوں نے لے لی تھی۔ رات چھائی تو گھپ اندھیرے نے اس غیر معمولی تبدیلی میں خوف بھر دیا۔ پھر اچانک ڈھیر ساری خونخوار جھاڑیوں، کٹے درختوں، گھنے تنوں اور اوبڑ کھابڑ پگڈنڈیوں نے اُسے گھیر لیا۔

"وہ درختوں سے ٹکرا ٹکرا کے اس طرح اُچھل رہا تھا جیسے کھلاڑی دائرہ بنا کر فٹ بال کو ایک دوسرے کی طرف اُچھال رہے ہوں۔ لیکن اُسے دائرے سے باہر نہ نکلنے دیتے ہوں۔ آخر وہ گر گیا۔ صبح کو جس وقت سورج نکلا تو کالی سیاہ چونٹیوں نے اس کا سارا بدن ڈھانپا ہوا تھا۔کچھ پہچان ممکن نہ تھی کہ رات کے اندھیرے میں کون مارا گیا۔ "(۱۲)

اس کہانی کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ جب انسان فطرت کے ساتھ کھیلتا ہے تو اس کا نتیجہ کائنات، دنیا، ماحول اور حیاتیات کے ساتھ ساتھ خود اس کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔یہ ایک کڑوی حقیقت ہے کہ انسان نے فطرت میں کسی خوبصورتی کا اضافہ نہیں کیا۔ بلکہ اسے گہنایا ہے۔انٹارٹیکا، اسٹریلیا اور ایمازون کے جنگل گواہ ہیں کہ فطرت انسان کے بغیر کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ فطرت انسان کے بِنا رہ سکتی ہے۔ انسان اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔

اگر اس افسانے کو بطور علامت دیکھیں تو جنگل بذاتِ خود ایک بڑی علامت ہے۔ جو اپنے اندر کئی اسرار و رموز اور کئی سوال سمیٹے ہے۔ معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر کرتا اکیلا انسان شہر سے گاؤں تک کا فاصلہ، بیچ کا جنگل، کٹتے درخت، لمبی سیدھی پگڈنڈی، جھاڑیاں، اوبر کھابڑ راستے، گھپ اندھیری رات، حیرت اور خوف کے سائے، دور اُفق پار ستاروں کے دھڑکتے دل، گویا معانی کا ایک جہاں ہے اس میں۔ غالب کے کسی جان دار شعر کی طرح اس افسانے سے بھی کئی مطالب برآمد ہوتے ہیں۔ اکرام اللہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ خود کو علامتوں کے جہان میں گم نہیں ہونے دیتے۔ اور نہ ہی سطحی کہانی میں دھنس جاتے ہیں۔ وہ کہانی میں سے علامتیں پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں :

"اکرام اللہ کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ علامتوں کے ہجوم میں گھِر کر کہانی کو بھول نہیں جاتا۔ بلکہ اس کے ہاں علامت اور کہانی کے امتزاج سے افسانہ وجود میں آتا ہے۔ "(۱۳)

افسانہ" لے گئی پون اُڑا "اپنے اندر بے پناہ مشاہدات و تجربات، ڈھیروں جزیات اور گہرے سوالات سمیٹے ہے۔ جگر کے سرطان کے سبب مسعود احمد کے پاس جینے کو مشکل سے ایک ڈیڑھ مہینہ ہے۔ گندے نالے والی بستی کی اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی سے ہسپتال اور ہسپتال سے واپس جھونپڑی تک کا سفر، بیماری، کمزوری اور موت کی جانب بڑھتے تیز قدم اسے ماضی کے جھروکوں میں لے جاتے ہیں۔ بچپن کا چین سکون، انگلی کا کٹ جانا، ماں کی اس کے لیے تڑپ، باپ اور بہن بھائیوں کا پیار، ساتھ میں کھیلنے کودنے والے یار دوست، کالج کی زندگی، تحریکوں کا زور، ہجرت و فساد، ظفر کے سینے میں پیوست گولی، کامنی کی ننگی لاش، کرمو دھوبی کا بہیمانہ قتل، کالو بھنگی کے آنسو، شادو کی عصمت، گھر کے آنگن میں جلتی ماں باپ کی لاشیں، بہن کی چیخیں، سبھی اس ایک ہی سفر میں کوندتی جاتی ہیں۔

اپنی بدبو دار جھونپڑی اور موت کی جانب بڑھتا مسعود شہر کے ہنگامے اور چُندھیا دینے والی روشنیوں سے کچھ خیرات اپنی اندھی بستی کے لیے بھی چاہتا ہے۔ بیماری کی شدت سے اس کے دماغ میں ایک بھونچال سا آ گیا ہے۔ جو اس کے خیالات کی ڈھیر ساری لہروں کو تھپیڑے دے رہا ہے۔ اور وہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں ڈول جاتی ہیں۔ اچانک اس نے فیصلہ کر لیا، اس سے پہلے کہ کوئی مافیا اس کی جھونپڑی پر قبضہ جمائے وہ مرنے سے پہلے اسے شادو کی ماں اور سوتیلے باپ کے حوالے کر دے گا۔اس سے ماں باپ پر بوجھ سمجھی جانے والی بیٹی" شادو "کا بوجھ کم ہو جائے گا۔ سوتیلے بہن بھائیوں، موٹی توند والے بدبو دار سیٹھوں کا بوجھ، شراب کی حلق میں اُنڈیلی جانے والی ڈھیر ساری بوتلوں کا بوجھ، ہر رات شادو کے جسم کو نوچ کھانے والے خونخار پنجوں کا بوجھ۔ پچھلے برس گرا دیے گئے ناجائز بچے کا بوجھ، اپنے شوہر اور ہونے والے بچوں کے ارمانوں کا بوجھ۔

کالی رات کے نشے میں دُھت شادو ایک رکشے سے اُترتی ہے۔ بے سُرے، بے ڈھنگے انداز میں گانا گاتی ہوئی جھونپڑی کی جانب لُڑھکتی ہے :

"کوئی کرماں دی گل دس جوگی کدوں ماہی ساڈا گھر آوے گا

قہقہے مار کر ہنسنے لگی۔ کون جوگی؟ کیسے کرم؟ کس کا ماہی؟ کس کا گھر؟ یہ سب جھوٹ ہے۔ ڈھونگ ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ نہ ماننا۔ نہ ماننا۔

لاؤ سپیکر پہ آواز گونجی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ خدا ابھی آسمانوں پہ زندہ ہے؟"(۱۴)

کریہ الشکل بکھرے ماضی کے کربناک خیالات کو سمیٹتا کردار ہم سب سے پوچھتا ہے کہ کیا "خدا "اب بھی آسمانوں میں زندہ ہے؟ اور یہ سب نا انصافیاں چُپ چاپ دیکھ رہا ہے۔ ایک انسان جس کی زندگی کی زنجیر اچانک کھچ گئی ہو اور اُسے اپنی موت کا پتا چل گیا ہو تو زندگی کا تیزی سے بڑھتا پہیہ یوں ہی جام ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے پیچھے ماضی کی سبھی بوگیوں کو دیکھتا جاتا ہے۔ وہ ساری سچائیاں اپنے تلخ ذائقے کے ساتھ اس کے گلے میں اُتر جاتی ہیں۔ جنہیں وہ زندگی کی رعنائیوں کے پیچھے دوڑتا ہوا نظر انداز کر آیا تھا۔

"راہ کا پتھر "پنجاب دھرتی کے لازوال کردار ہیر رانجھا کی داستان پر مشتمل ڈرامہ ہے۔ جس کے کل تین سین ہیں۔ ہیر کی سیدے کھیڑے سے شادی ہو چکی ہے۔ رانجھا کان چھِدوا، سر مُنڈوا، انگ انگ بھبوت رما، پا پیادہ منزلیں مارتا، مصیبتیں اُٹھاتا، جوگی بنا،ہیر سے ملنے آ پہنچا ہے۔ ہیر اپنے رانجھے کے لیے کب سے تڑپ رہی تھی۔ وہ اپنے رانجھن کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ مگر سیدا اپنی محبت اور چاہت سمیت آڑے آ جاتا ہے اور ہیر سے اپنے پیار کی بھیک مانگتا ہے۔ روتا تڑپتا ہے کہ تیرا یہ نفرت کا زہر مجھے گھول ڈالے گا :

> "سیدا : مجھ پر سے اپنی نفرت کا بوجھ اُٹھا لو۔ میں اسے اور نہیں سہار سکتا۔میں اس کے نیچے دبا جا رہا ہوں۔پسا جا رہا ہوں۔ میری ہڈیاں تڑخ تڑخ بول اُٹھی ہیں۔
>
> ہیر :مجھے تم سے کوئی نفرت نہیں۔ تم میرے لیے اس طرح ہو جیسے ...جیسے وہ درخت، جیسے یہ خاک، جیسے کوئی پتھر، راہ کا پتھر، جسے راہ سے ہٹانا ضروری ہو۔ "(۱۵)

سیدے کا ہیر کے لیے عشق اور حالتِ زار دیکھ کر رانجھا اپنے حق سے دستبردار ہو کر جانے لگتا ہے۔ مگر سیدے کی بہن سہتی راز فاش کر دینے کی دھمکی دے کر اُن دونوں کو ساتھ ملا لیتی ہے۔ سہتی ایک رات ہیر کے سانپ سے ڈسے جانے اور جوگی سے علاج کا بہانہ بنا کر گھر سے نکلتی ہے۔ا ور پھر ہیر رانجھا سمیت اپنے عاشق مراد بلوچ کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ ہیر رانجھا ایک گاؤں میں جا پناہ لیتے ہیں۔ مگر سیدے کا باپ اجو چودھری بھی اپنے قبیلے سمیت اُن تک جا پہنچتا ہے اور قاضی صاحب کی مدد سے اپنی بہو کو واپس لے جاتا ہے۔ ادھر گاؤں میں اچانک آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ سب کا یہی ماننا ہوتا ہے کہ یہ جوگی(رانجھا) اور جوگن(ہیر) کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا نتیجہ ہے۔ جس پر راجہ، اجو

چودھری، سیدے، ہیر اور رانجھے کو دربار میں حاضر کرنے کا فرمان جاری کرتا ہے۔ اجو چودھری ہیر کو اپنی بہو بتاتا ہے مگر سیدا ہیر کے عشق میں سدھ بدھ کھو چکا ہے۔ وہ جنون کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں جا چکا ہے۔ ہیر کی" راہ کا پتھر "ہٹ چکا ہے۔سیدے کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے راجہ فیصلہ سناتا ہے :

"راجہ :نیاے یہی ہے کہ یہ عورت جوگی کی ہے اور اسی کو دی جاتی ہے۔ "[۱۶]

گاؤں میں بھڑکی آگ بجھ جاتی ہے۔ پَر آگ کہاں بجھی ہے۔ جوگی کو ہیر مل گئی۔ مگر پتھر بنے سیدے میں سے ایک اور رانجھا نمودار ہے۔ ایک اور رانجھا۔ اور یہ کیسا انصاف تھا جو ایک آگ سے پھوٹا تھا۔ کیا ہر سچ کے لیے ایک معجزہ، ایک کرامت ضروری ہوتی ہے۔ کیوں وقت کا نمرود انصاف کے تقاضوں اور عشق کی گہرائیوں کو نہیں پا سکتا۔ کیوں ہر بار اولادِ ابراہیم کو آگ کا امتحان دینا پڑتا ہے۔ کیا اس بار نمرود واقعی انصاف کرنا چاہتا تھا۔ یا پھر ۔

تنہا میں جل رہا تھا تو خوش ہو رہے تھے لوگ اُن تک گئی جو آگ، بجھانے لگے مجھے[۱۷]

اس تمثیلی کہانی نے اپنا ہیرو بدلا ہے۔ ہر بار رانجھا ہی ہیرو نہیں ہو سکتا۔ اس بار سیدا ہیرو ہے۔ وہ ہیر کے لیے جنون اور جذب و مستی کے دریا پار کر چکا ہے۔ اب کے ہیر کو پا لینے والا رانجھا نہیں،عشق کے لیے خود کو تیاگ دینے والا سیدا ہیرو ہے۔

افسانہ"پکنک "دفتر سے شکار اور پکنک کے بہانے دریا کنارے تھکن اتارنے آئے تین دوستوں کی کہانی ہے۔ افضل، رحمان اور جعفر بہتے دریا میں کینچوے لگے کانٹے ڈال کر مچھلی کا شکار کھیل رہے ہیں۔ مگر شکار میں ناکامی پر ہینڈ پمپ تلے نہاتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں۔ اٹھکیلیاں کرتے ہیں، ستاتے ہیں اور تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ ادھر سورج ڈوب رہا ہے اور شکار ندارد۔ جعفر غصے میں اپنی بندوق سے دو کارتوس دریا پر فائر کر دیتا ہے۔ آٹھ دس کلو کی ایک مچھلی خون میں لت پت پانی کی سطح پر نکلتی ہے اور چلتے پانی کے ساتھ بہتی جاتی ہے۔ تینوں اس کے تعاقب میں پل تک دوڑتے ہیں مگر وہ رات کے اندھیرے میں کہیں کھو جاتی ہے۔افضل اور رحمان کے طیش دِلانے پر جعفر اپنے شکار کو پانے کی دھن میں پل سے دریا میں چھلانگ لگانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا بدلتا ارادہ دیکھ کر افضل اسے شغل شغل میں دھکا دے دیتا ہے :

"وہ پانی کی طرف منہ کر کے پل کے آخری سرے پہ اپنا بدن تول کر کھڑا ہو گیا۔ پھر چھلانگ لگانے کے انداز میں دوہرا ہو گیا۔ ایک، دو، تین ابھی تک نہیں گرا، شاید اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ یہ ہمیشہ سے اسی طرح کا ہے۔

میں نے اپنا پاؤں آگے بڑھا کے اسے پیچھے سے ہلکا سا ٹھوکرا لگا دیا۔ گیا۔ نیچے پانی کا عفریت ہونک رہا تھا، غل مچا رہا تھا۔۔۔ سر کے بل گیا ہے نا۔ "[۱۸]

اب افضل اور رحمان، جعفر کی زندگی کی فکر کرنے کی بجائے اس پہ بحث کر رہے ہیں کہ جعفر سیدھا پانی میں گرا یا منہ کے بل۔ دائیں مونچھ پہلے بھیگی ہو گی یا بائیں۔ یا پھر آہنی پل کے مضبوط گاڈروں سے جا ٹکرایا ہو گا؟ افسوس !وہ چشمہ، ہیٹ، رومال، جوتا اور شکار کی گئی سون چڑی بھی پتلون کی جیب میں دبائے اپنے ساتھ لے گیا۔ ہاں، انہیں کچھ فکر ہے تو اتنی کہ کار کی چابی شاید جعفر اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ یا پھر شاید ...

"یہ تو اب جعفر ہی بتا سکتا ہے اور وہ اس وقت مچھلیوں کے درمیان ہو گا۔ وہ اس کے سینے پر لوٹ رہی ہوں گی۔ اُس کے نتھنوں میں گھس رہی ہوں گی، اُس کی مونچھوں سے کھیل رہی ہوں گی'۔۔۔'یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی مچھلی اُسے کینچوا سمجھ کر ہڑپ کر گئی ہو۔' 'چلو آج کے دن میں کسی مچھلی نے کسی کینچوے کو کھایا تو سہی۔ "[۱۹]

کچھ لوگ کس طرح اپنے چھوٹے موٹے شغل کے لیے دوسروں کی جان داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ صرف اپنی بوریت دور کرنے کے لیے کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔ یہ تک نہیں سوچتے کہ ہمارے اس عمل سے دوسروں پر اور انسانیت پر کیا گزرے گی۔ انہیں فکر ہوتی ہے تو فقط اپنی۔ دل بہلانے کی غرض سے پلنے والی کم وقعت خواہشوں کی۔ چاہے فطرت، انسان اور انسانیت کو اس کی کتنی بھی قیمت چکانی پڑے۔

یہ افسانہ اپنے اندر بے پناہ امیجری سمیٹے ہے۔ اس قدر عمیق مشاہدہ گواہ ہے کہ یا تو افسانہ نگار بارہا مچھلی کے شکار پر جا چکا ہے۔ یا پھر کہانی لکھتے وقت وہ دریا کنارے اس بڑے کنکھجورے کی شکل دکھائی دینے والے پُل کے سامنے بیٹھا تھا۔ بہت سی امیجز تو اس قدر دلچسپ ہیں کہ قاری ایک لمحے کو تحیر اور مسرت کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔غیر مرئی چیزوں اور حشرات الارض کا بیان بھی کس خوبی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کی سانسوں کے ساتھ دھڑکنے لگتا ہے۔ مچھلی پھانسنے واسطے، دریا کی نرم ریت سے نکالے گئے کینچوے کا بیان دیکھیے :

"سیاہی مائل بھورے رنگ کے انگلی جتنے لمبے کلبلاتے کینچوے نم آلود زمین میں اپنے بوجھوں سے جُتے ہوئے ماچس کی تیلی جتنے موٹے جسموں کو بڑی افراتفری کے عالم میں نہایت تیزی سے ڈھو کر کہیں لے جانا چاہ رہے تھے۔مگر کہیں

بھی نہیں جا رہے تھے۔ وہ اتنی تیزی میں تھے کہ اگر اُن کے جسم نہ ہوتے تو اب تک سات آسمان عبور کر گئے ہوتے۔۔۔ کانٹا کینچوے کے آر پار اُتر رہا تھا۔ کینچوے کے بدن میں اُٹھتے ہوئے درد کااظہار کرنے کے لیے شکنیں شاید اُس وقت ہمارے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ یا نہیں پڑ رہی تھیں۔ کینچوا ایک جھٹکے سے بل کھا کے گول دائرہ بن گیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ پیازی رنگ کا پانی زیادہ سے زیادہ ایک قطرہ ڈھلک کر ریت میں جذب ہو گیا۔"۔[۲۰]

حسن نظامی نے جس طرح ایک جھینگر کو انسانی اذہان میں زندہ کیا تھاا سی طرح اکرام اللہ بھی بے وقعت سمجھے جانے والے کینچوے کے بارے میں بھی احساس جگا دیتے ہیں۔ دریا کی روانی اور انسانی محسوسات کا بیان دیکھیے :

"وہ ساکت پانی قریب سے دیکھنے پر کھسکتا ہوا ہمارے پاؤں کے نیچے سے نکلتا ہوا دوسری جانب گہرائی میں چیختا، چنگھاڑتا، غل مچاتا، کف اُڑاتا اپنے بدن میں سموئی ہوئی پہاڑوں کی منوں مٹی کو بلوتا، آسمان کو گھورتی اندھی بھنور کی بے بس آنکھیں بناتا، مٹاتا کسی بڑے زخمی جانور کی طرح صحرا میں بھاگا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ کھسکتے پانی کو تھوڑی دیر نظر جما کے دیکھنے سے محسو س ہوتا جیسے میں بھی کھسکتاہوا ساتھ چلا جا رہا ہوں، پل بھی چلا جا رہا ہے۔ دیوار کو مضبوطی سے تھام لیا۔ سر کو زور سے ایک جھٹکا دیا، اوہ خدایا جھوٹ تھا۔ "[۲۱]

اسی طرح جزیات نگاری، منظر نگاری اور محسوسات کا ایک جہان ہے۔ ظاہر ہے ایک آرٹیکل میں مکمل پہلو بیان نہیں ہو سکتے۔ یہ سب تو پڑھنے سے علاقہ رکھتا ہے۔ اس لیے میں بس ایک اور حوالہ پیش کیے دیتا ہوں۔اکرام اللہ لفظوں سے موسیقی بُنتے اور آوازیں پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ موت کی جانب بڑھتے قدم اچانک مستقبل کی سوچوں اور ماضی کے خیال خرابوں میں کہیں کھو جاتے ہیں۔ اور مریض ان سب سے تھک ہار کے ایک بند دوکان کی سیڑھیوں پر ستانے بیٹھ جاتا ہے۔ ہارن بجاتی گاڑیاں تیزی سے گزر چکیں تو چوک کی جلتی بجھتی روشنیوں کے درمیان اچانک :

"ہوا تیز ہو گئی۔ خالی سڑک پر اخباروں کے ٹکڑے، چکنائی والے کاغذ، سگریٹ کی خالی ڈبیاں زندہ چیزوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتے، بھاگتے، چکر کھاتے پھر رہے ہیں۔ میرے پیچھے ٹن نانا ٹنک، ٹن نانا ٹنک کا کان پھاڑ دینے والا شور

تیزی سے چلا آ رہا ہے۔ ریل کا انجن آ گیا، کوئی بلڈنگ گر رہی ہے۔ میری چھرکی نکل گئی۔ ٹین کا خالی ڈبہ ہوا کے زور کے آگے لڑھکتا ہوا نالی میں جا گرا۔ "(۲۲)

اکرام اللہ چونکہ زود نویس نہیں اس لیے اس کا قلم بیانیے، مکالمے، مشاہدے، محسوسات، شعور اور لاشعور کا کھیل، کردار نگاری اور امیجری کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔معمولی کہلائی جانے والی چیزوں کا غیر معمولی بیان اس کا خاصہ ہے۔ انسانی نفسیات، بنیادی نکاتِ زندگی،مرئی و غیر مرئی، حشرات الارض اور آس پاس کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک کو اس گہرائی اور گیرائی سے دیکھتا ہے کہ قاری فطرت، ماحول اور کائنات میں چھپی چیزوں کے اس رُخ کو جان کر دلچسپ تحیر اور راحت میں غرق ہو جاتا ہے۔ چند ایک خامیوں، جنہیں پچھلے صفحات میں بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے، کے علاوہ اس مجموعے کے قریباً سبھی افسانے اپنے اندر یہی خوبیاں لیے ہوئے ہیں۔ اکرام اللہ کا عمیق مطالعہ و مشاہدہ ان کہانیوں میں آشکارہ ہوا ہے۔ ان کہانیوں نے اکرام اللہ کو اُردو افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں لا کھڑا کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اکرام اللہ،جہانِ گزراں،لاہور :القا پبلی کیشنز)ریڈنگز(، ۲۰۱۹ء، ص ۸

۲۔ اکرام اللہ،سائے کی آواز،لاہور :سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۸۸

۳۔ اکرام اللہ،جنگل،لاہور :سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۲۳

۴۔ ایضاً، ص ۲۶

۵۔ ایضاً، ص ۲۹

۶۔ ایضاً، ص ۴۴

۷۔ ایضاً، ص ۵۳

۸۔ منٹو، سعادت حسن،منٹو راما،لاہور :سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۶

۹۔ اکرام اللہ،جنگل،ص ۵۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۱۔ نیّر مسعود،افسانے کی تلاش،کراچی :شہرزاد، ۲۰۱۱ء، ص ۴۰

۱۲۔ اکرام اللہ،جنگل،ص ۷۸

۱۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر،اردو افسانہ :ایک صدی کا قصہ، ملتان :کتاب نگر، ۲۰۱۷ء، ص ۶۲۲

۱۴۔ اکرام اللہ، جنگل، ص ۱۰۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۱۷۔ مظفر وارثی، راکھ کے ڈھیر میں پھول،لاہور :ماورا پبلشرز، ۲۰۰۱ء، ص ۱۹

۱۸۔ اکرام اللہ،جنگل،ص ۱۵۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۲۲۔ ایضاً، ص۹۸، ۹۹

References in Roman Script:

1. Ikramullah, Jahan e Guzraan, Lahore: Alqa Publications (Readings), 2019, Page 8
2. Ikramullah, Saaye ki Aawaz, Lahore: Sang e meel Publications, 2001, Page 88
3. Ikramullah, Jungle, Lahore: Sang e meel Publications, 1990, Page 23
4. Ibid, Page 26
5. Ibid, Page 29
6. Ibid, Page 44
7. Ibid, Page 53
8. Manto, Saadat Hassan, Manto Rama, Lahore: Sang e meel Publications, 1998, Page 196
9. Ikramullah, Jungle, Page 59
10. Ibid, Page 60
11. Nayyar Masood, Afsany ki talash, Karachi: Shehrzad, 2011, Page 40
12. Ikramullah, Jungle, Page 78
13. Anwaar Ahmad, Dr., Urdu Afsana- Aik sadi ka qissa, Multan: Kitab nagar, 2017, Page 622
14. Ikramullah, Jungle, Page 104
15. Ibid, Page 110
16. Ibid, Page 135

17. Muzaffar Warsi, Raakh k dheir main phool, Lahore: Mawara publishers, 2001, Page 19
18. Ikramullah, Jungle, Page 153
19. Ibid, Page 156
20. Ibid, Page 139
21. Ibid, Page 137
22. Ibid, Page 98, 99